ن م راشد کی شاعری میں فکری مزاحمت کے چند پہلو

تنویر صاغر

The Progressive Writers' Movement, in its shift of preference for themes, had paved a new path for talented poets like Rashed. However, Rashed was criticised as being profane in his treatment of themes. Tanveer Saghir views Rashed's poetry in a different, more positive perspective on his one hundredth birth anniversary.

عجلت پسندی کے رویے نے ہمارے عہد کی اجتماعی زندگی میں جس نوع کی صارفیت اور جہل کی خلاؤں پر حکومت کرتی بے حسی کو جنم دیا ہے، اس کی گونج ہمارے معاشرے کی اجتماعی نفسیات میں رواں دواں ہے۔ اور حسیات کے ساتھ ساتھ تاریخ و تہذیب کی غلط سمت میں بھٹکتے انسان کے آشوب اور اذیت کا نوحہ اس عہد کے لکھنے والوں میں بہت کم ملتا ہے۔ کیوں کہ جہاں اپنے اندر اور باہر کے متن کو پڑھنے اور پرکھنے کی صلاحیت مفقود ہو جائے وہاں شعور اور لاشعور کے مضافات میں تخلیقی حرارتوں کو روندنے والی کئی سرگرمیاں اس تخلیق کے میدان کو جنگ کا میدان بنا دیتی ہیں۔ اقبال کے بعد انسان کے وجدان، حسیات اور تعقلات کی حشر گاہ کے اس المیے کا بیان جن شاعروں میں بہت نمایاں ملتا ہے، ان میں ن م راشد کا نام سرفہرست ہے۔ تخلیق کے تمام طے شدہ مظاہر سے کی جانے والی شاعری لفظ و معنی کی دنیا سے بے نیاز ہو کر آوازوں، حرکتوں اور تمام تر حسی مدرکات سے لیس جس بسیط و عریض جمالیاتی آفاق کی آبادکاری کرتی ہے، اس آفاق کی چھاؤں میں سرگرداں آج کا انسان، ان کی شاعری کا موضوع ہے۔ ہمارے اس عہد کے مسائل و

وسائل سے پیدا ہونے والی افسردگی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی دھند میں لپٹے انسان کا المیہ راشد کے بے مثال تخلیقی جذب، فکری انہماک اور تخیل کی جست کے ساتھ ہمارا استقبال کرتا ہے۔

جب معاشرے میں چار سو مفاہمت کی فضا راہ پا چکی ہو، ایسے حالات میں مزاحمت کی بات کرنا بڑا عجیب سا دکھائی دیتا ہے۔ بیشتر تخلیق کار اس احتجاجی موسم میں زندہ تو ہیں مگر خاموشی کے ساتھ۔ راشد اپنے کئی معترضین کے لئے ناپسندیدہ شخصیت تھے۔ فکر کے فروغ میں اقرار اور انکار کے راستے ہی سب سے زیادہ معاونت کرتے ہیں۔ اور یہی ایک ایسا منطقہ ہے جہاں معترضین معمولی سی مشقت کے سہارے اپنے گرد و پیش میں 'تبدیلی کے احساس' یا 'احساس کی تبدیلی' سے عاری اپنی روایتی فکر پر غور کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ راشد نے معاشرتی اقدار، مذہبی اخلاقیات، سیاسی و احتجاجی رویوں اور نو آبادیاتی پہلوؤں پر بڑی دلیری سے ضربیں لگائی ہیں جنھیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ ساٹھ کی دہائی میں فرانز فینن کی کتاب "The wretched of the earth" نے لوگوں کی توجہ اس جانب مرکوز کرائی کہ تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک میں ظلم، استحصال اور تشدد نے کس انداز میں ان ممالک کو ثقافتی، تہذیبی اور سماجی سطح پر کھوکھلا کر دیا ہے۔ سارتر نے تو دیباچے میں یہ بھی لکھا کہ:

> ''تشدد کے زخموں کا علاج اخلاق کے اظہار سے ممکن نہیں۔ انھیں تو محض تشدد ہی مندمل کر سکتا ہے۔۔۔ اور ہمارے ساتھ محض یہ ہوا کہ ماضی میں ہم تاریخ بناتے تھے۔ اب ہم پر تاریخ بن رہی ہے۔''

تا حال بھی ہماری فکری قیادت ملکی برآمدات میں شامل ہے۔ جہاں استحصال زدگان کے لئے احتجاج اور مزاحمت واحد راستے ہیں۔ راشد کی شاعری میں فکری آزادی اور داخلی خود مختاری ایسے موضوعات ہمیں احساس دلاتے ہیں کہ محکوم قوم کے اعمال اور اندازِ فکر کس طرح صاحبِ اقتدار کے پاؤں تلے مسخ ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری کی بابت ردِ نو آبادیاتی رویے اور احتجاج نے محض دانش ورانہ نقطۂ نظر کا اظہار نہیں بلکہ ان کا اسلوب بھی اس مزاحمتی عمل میں شامل ہے۔ وہ انگریزوں سے نفرت کا اظہار یوں کرتے ہیں:

زندگی تیرے لئے بستر سنجاب و سمور
اور میرے لئے افرنگ کی دریوزہ گری

راشد کی شاعری میں جن مسائل کو پیش کیا گیا ہے اور ردِ عمل کے ہنگام میں جو احتجاج اور مزاحمتی رویہ ملتا ہے۔ وہ ان کی معاشرے سے اٹوٹ وابستگی کا ثبوت ہے۔ ان کا باغیانہ لب و لہجہ ان کی شاعری کی نظریاتی سمت بھی متعین کرتا ہے۔ ان کے ہاں سیاسی، مذہبی، غرض کہ ہر نوع کی بالادستی کے خلاف بغاوت ملتی ہے۔ ان کی شاعری، ان کے عصر کو سمجھنے، پرکھنے اور نئے مظاہر دریافت کرنے کا فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ نئے انسان کے ذہنی و جذباتی، سماجی اور روحانی مسائل کا حوالہ بھی ملتا ہے۔ انھوں نے انسان کے داخلی و روحانی ہیجانات اور اس سے مربوط انفرادی و اجتماعی مسائل کا بھی احاطہ کیا ہے۔

یہ بات بلا خوفِ تردید کی جا سکتی ہے کہ ہر عہد کی بڑی شاعری میں ایک خاص نوعیت کی معاشرتی شکست و ریخت، فکری کج روی اور تہذیبی و سماجی اقدار کے نشانات موجود ہوتے ہیں اور یہ سامراج دشمنی کے خاص رویے اس عہد کے سیاسی و ادبی منظر نامے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ راشد کے ہاں مذہبی انتہا پسندی کے بجائے انسان دوستی، اعلیٰ انسانی و اخلاقی اقدار اور معروضی حالات کی بے سمتی اور بے بسی کے مقابلے میں خواب و افکار کے جہان میں بسیرا کرنے پر اصرار درحقیقت آدرش پسندی کے مختلف حوالے ہیں۔

راشد جدید نظم کا شاعر ہے جس کے یہاں نو آبادیاتی نفسیات کو بڑے منطقی اور استدلالی انداز میں دیکھنے اور پرکھنے کا انداز ملتا ہے۔ یہ بات بھی بجا طور پر درست ہے کہ ان کی شاعری کے پس منظر میں مایوسی، لایعنیت، بے سمتی اور داخلیت کا ایک بھرپور حوالہ ملتا ہے مگر یہ سب رویے نو آبادیاتی معاشرے کی سائیکی کا بھی تو حصہ ہیں۔ بہر حال راشد کے شاعرانہ نظام میں اس نو آبادیاتی سائیکی کا جواز مذہب سے بے زاری اور عدم اعتماد کی صورت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ راشد کے اس ردِ نو آبادیاتی رویوں، آدرش پسندی اور احتجاج کے تین اہم پہلو ہیں۔

ایک پہلو تو مذہب سے بے زاری اور بغاوت ہے۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کی

غلامی اور فکری معذوری کا باعث یہ مذہب ہی ہے۔ ان کے خیال میں مذہب فرد کی آزادی کو سلب کر لیتا ہے اور اسے فکری طور پر مفلوج کر دیتا ہے۔ اور فرد ساری زندگی ہر شے سے بے نیاز ہو کر مذہب کے تحفظات میں مصروف رہتا ہے۔ وہ جمود کا شکار، مذہب کے خاتمے کی خواہش رکھتے ہیں، اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان کے ہی اس تصور کے پس منظر میں موجود انسان کی بے بسی، بے حسی، نجی مفادات، ناانصافی اور معاشرتی بے اعتدالیاں ہیں۔

نظم 'مکافات' میں خدا سے تعلق کا حوالہ ملتا ہے مگر بعد میں وہ یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

کیوں دعائیں تیری بے کار نہ جائیں
تیری راتوں کے سجود اور نیاز
(اس کا باعث مرا الحاد بھی ہے)

تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں
اور اگر ہے، تو سراپردۂ نسیان میں ہے
(شاعرِ درماندہ)

اسی مینارے کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بے کار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت اداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں

ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی
(دریچہ کے قریب)

کون جانے کہ وہ شیطان نہ تھا
بے بسی میرے خداوند کی تھی
(گناہ)

شبنمی گھاس پہ دو پیکرِ یخ بستہ ملیں،
اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے
(اتفاقات)

بنا لی اے خدا، اپنے لئے تقدیر بھی تو نے
اور ہم انسانوں سے لے لی جرأتِ تدبیر بھی تو نے
خدا سے بھی علاجِ دردِ انساں ہو نہیں سکتا

اس غور و تجسس میں کئی راتیں گزاری ہیں
میں اکثر چیخ اٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر
(انسان)

دوسرا پہلو عشق و محبت کے مروجہ تصور کو انسانی جبلتوں سے گرانا ہے۔ جیسے ''داشتہ''، ''سرگوشیاں''

تجھ سے وابستگیِ شوق بھی ہے

ہو چلی سینے میں بیدار وہ دلسوزی بھی
مجھ سے مہجورِ ازل جس پہ ہیں مجبورِ ازل!
نفسِ خود بیں کی تسلی کے لیے
وہ سہارا بھی تجھے دینے پر آمادہ ہوں
تجھے اندوہ کی دلدل سے جو آزاد کرے
کوئی اندیشہ اگر ہے تو یہی
ترے ان اشکوں میں اک لمحے کی نومیدی کا پرتو ہو کہیں
اور جب وقت کی امواج کو ساحل مل جائے
یہ سہارا تری رسوائی کا اک اور بہانہ بن جائے
جس طرح شہر کا وہ سب سے بڑا مردِ لئیم
جسم کی مزدِ شبانہ دے کر
بن کے رازق تری تذلیل کیے جاتا ہے
میں بھی باہوں کا سہارا دے کر
تیری آئندہ کی توہین کا مجرم بن جاؤں
(داشتہ)

تیسرا پہلو سیاسی بغاوت ہے جو ایشیائی ممالک پر برطانوی سامراج کے تسلط سے متصل ہے۔ اس نوع کا احتجاج ان کے دیگر معاصرین کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے مگر راشد نے استعاراتی و علامتی انداز میں اسے آفاقیت بخشی ہے وہ یوں کہ یہ نظمیں آج بھی غیر ملکی قبضوں کی داستان کا خوب صورت نمونہ بن جاتی ہیں۔ ان نظموں میں سیاسی زوال کا نوحہ بھی کہتے ہیں اور ''ایران میں اجنبی'' کی زیادہ تر نظمیں نہ صرف ایران کے سیاسی و سماجی ماحول کی عکاس ہیں بلکہ پوری دنیا کے مظلوم طبقات کی نمائندہ ہیں۔ وہ ایشیا کے تمام محکوم ممالک کی محرومیوں کا تذکرہ بھی

کرتے ہیں اور ہندوستان کے حالات کو استعاروں اور علامتوں میں پیش کرتے ہیں:

اس کا چہرہ، اس کے خدوخال یاد آتے نہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ''ہونٹوں'' نے لیا تھا رات بھر
جس سے ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے!
(انتقام)

ایک لمحے کے لئے دل میں خیال آتا ہے
تو مری جان نہیں
بلکہ ساحل کے کسی شہر کی دوشیزہ ہے
اور ترے ملک کے دشمن کا سپاہی ہوں میں
(بیکراں رات کے سناٹے میں)

وہ حسیں اور دور افتادہ فرنگی عورتیں
تو نے جن کے حسن روز افزوں کی زینت کے لیے
سالہا بے دست و پا ہو کر بنے ہیں تار ہائے سیم و زر
ان کے مردوں کے لئے بھی آج اک سنگین جال
ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال
(زنجیر)

ں کے علاوہ دیگر کئی نظمیں ایسی صورتِ حال کا اشاریہ ہیں مثلاً 'پہلی کرن'، 'من و
ت'، 'کون سی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم'، 'تیل کے سوداگر'، 'کیمیا گر'، 'درویش' وغیرہ

ے عہد کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ فکری انجماد اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ ثقافتی بے-
س جزیرے کی نمائندگی اور اشتہار باز نفسیات کے حامل اس معاشرے میں راشد
ی مزاحمت اور ردِ نوآبادیاتی سیاق و سباق کا نہایت عمدہ اور تخلیقی اظہار ہے۔
میں اس شاعری میں نئی دانش وری کی تلاش، فکری اثاثے سے نئے خیالات کا
ے کے شعور سے نئے تصورات کی نمو پذیری اور زندگی کی بے معنویت کے منظم
سیاسی و قومی بدحالی اور استعماری تسلط کے خلاف فکری مزاحمت ایسی متنوع جہات
ں کے مصنوعی دائروں کے اختتام اور کسی حد تک انسانی عناصر کی بحالی کا جتن کرتی
ہم آج بھی دوچار ہیں۔ کیوں کہ آج بھی ہماری تہذیبی و ثقافتی شناخت کو مسخ
بڑی ثابت قدمی اور استقلال سے مختلف حربے آزمائے جا رہے ہیں۔ اس سیاق
ری کی معنویت مزید دوچند ہو جاتی ہے کہ ان کا مزاحمتی احساس تہذیب و ثقافت
ے جرأت رکھتا ہے جہاں بدلتے ہوئے تہذیبی مظاہر اپنی وحدت کو قائم رکھتے ہیں۔
ں افزائش میں ایسے دانش وروں اور تخلیق کاروں کی ضرورت ہے جن سے فیض
سلی طور پر پہچانا جائے۔